آج۔کل

مائل خیرآبادی

یادِ خدا

ایک سوداگر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے بہت دولت دی تھی۔ لیکن وہ سوداگر بہت ہی کنجوس تھا۔

ایک روز وہ کھانا کھا رہا تھا۔ اس کی بیوی بھی کھانا کھا رہی تھی۔ دستر خوان پر بہت عمدہ گوشت پکا ہوا رکھا تھا۔ جس کو وہ بہت پسند کرتا تھا۔ اسی وقت ایک فقیر آیا اور کہنے لگا کہ ''اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔'' یہ سنتے ہی اس کی بیوی نے شوہر سے کہا ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ دولت دی ہے جس سے ہم اچھے کھانے کھا رہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں گوشت فقیر کو دے دوں۔'' شوہر نے کہا۔ ''ہم نے اپنے کھانے کے لئے یہ گوشت تیار کیا ہے۔ بھلا ہم فقیر کو کیسے دے سکتے ہیں۔'' یہ سن کر بیوی نے کہا۔ ''یہ گوشت جو ہم کھا رہے ہیں وہ اللہ ہی نے تو دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ غریبوں کی مدد کرو۔ ہمارا فرض ہے کہ یہ گوشت فقیر کو دے دیں۔'' اس طرح بہت سمجھاتی رہی۔ مگر اس کی کسی بات کو شوہر نے نہ مانا۔ اور اس نے فقیر کو دروازے سے دھکّا مار مار کر بھگا دیا۔

یہ دیکھ کر بیوی کو دکھ ہوا۔ اس نے کئی بار شوہر کو نصیحت کی کہ وہ اللہ کی راہ میں کچھ نہ کچھ ضرور دیا کرے۔ لیکن شوہر اس سے ناراض ہو گیا اور اسے بھی گھر سے نکال دیا اور طلاق دے دی۔ کچھ دنوں کے بعد عورت نے ایک دوسرے سوداگر سے شادی کر لی۔ یہاں بھی ایک روز جب یہ دونوں میاں بیوی کھانا کھانے بیٹھے تو ان کے سامنے تلا ہوا گوشت رکھا تھا۔ اتنے میں ایک فقیر آیا اور کہنے لگا کہ ''اللہ کے نام پر مجھے تھوڑا کھانا دو، میں بہت بھوکا ہوں۔'' یہ سنتے ہی اس کی بیوی نے اپنے شوہر سے کہا کہ ''دیکھو یہ گوشت اللہ نے دیا ہے اور ہم پھر ایسا ہی گوشت دوبارہ بھی تیار کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو یہ گوشت میں اس فقیر کو دے دوں۔''

یہ سنتے ہی شوہر نے کہا ''بے شک یہ گوشت خوشی سے فقیر کو دے سکتی ہو۔''

بیوی نے جا کر گوشت اس فقیر کو دے دیا۔ جب فقیر کو گوشت دے کر واپس ہوئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ رونے لگی۔ یہ دیکھ کر سوداگر نے جو اس کا نیا شوہر تھا، پوچھا۔ ''بتاؤ کہ تم

کیوں رو رہی ہو؟'' بیوی نے پہلے تو بتانے سے انکار کیا۔ مگر شوہر نے بار بار پوچھا تو بتانا پڑا، کہنے لگی کہ یہ جو فقیر اپنے گھر پر آیا تھا، وہ ایک دوسرے شہر کا سوداگر تھا۔ وہ بڑا مال دار تھا۔ وہ بھی تمہارے جیسا ہی امیر تھا۔ مگر وہ اللہ کی راہ میں خیرات نہیں کرتا تھا۔ یہ فقیر میرا وہی شوہر تھا۔ ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ ایک روز شام کے وقت ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایک فقیر آیا اور کہا۔ ''اللہ کے نام پر کچھ کھانے کو دو تو اس پر دھکّے دے کر بھگا دیا۔ آج وہ فقیر ہو گیا۔ اور بھیک مانگتا ہوا ہمارے دروازے تک آیا۔ اللہ کے ہاتھ میں امیر کو غریب بنانا اور غریب کو امیر بنانا ہے۔'' یہ سن کر اس نے کہا۔ ''اس وقت جو فقیر تمہارے پاس گیا تھا وہ میں ہی تو تھا۔''

مالک

''خبردار اِدھر قدم مت رکھنا!''

''کیوں؟ تم کون ہوتے ہو؟''

''بتا دوں! میں کون ہوں۔ گدھے کہیں کے!''

''میری گھاس بھی چر لی۔''

''میری گھاس بھی چر لی اور زبان لڑاتا ہے!''

''گھاس کیا تیرے باپ کی ہے؟''

''اچھا تو اس طرح نہ مانے گا، لے گھاس کھا!''

اس تو تو میں میں کے بعد بیل نے گدھے کے سینگ مار دیا۔ نوکیلے سینگ گدھے کی ران میں لگے اور خون نکلنے لگا۔ وہاں کچھ دوسرے جانور بھی تھے۔ وہ ان دونوں کی لڑائی دیکھ رہے تھے۔ وہ دوڑے دوڑے گئے اور جنگل کے بعت سے جانوروں کو بلا لائے۔

سب نے پوچھا۔ ''ارے او گدھے! کیا ہوا اور کیوں رو رہا ہے؟''

''دیکھتے نہیں! اس بیل نے مجھ پر کیسا ظلم کیا ہے۔ یہ دیکھو میری ران سے خون بہہ رہا ہے۔''

جنگل کے جانوروں نے بیل سے پوچھا۔ ''تو نے اس کے کیوں سینگ مارا؟ بیل نے جواب دیا کہ یہ گدھا میری گھاس چر رہا تھا۔''

بیل کی یہ بات سن کر گھوڑا بولا: ''کیوں رے بیل! تو گھاس کو اپنی بتا رہا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ میں گھاس کا سب سے زیادہ شوقین ہوں۔ **گھاس میری ہے کہ تیری؟**''

اور یہ کہہ کر گھوڑے نے دولتّی بیل کے جمائی۔ بیل نے چاہا کہ دولتّی کا بدلہ لے اور گھوڑے پر بھی سینگوں سے وار کرے۔ لیکن جنگل کے سارے جانوروں کو دیکھ کر سہم گیا۔

بیل تو سہم چکا تھا اس لئے وہ کچھ نہ بولا۔ لیکن ایک بھینسے نے گھوڑے کو ڈانٹا۔ ارے او گھوڑے! تو کون ہے، گھاس کو اپنی بنانے والا۔ گھاس کا مالک میں ہوں۔" یہ کہہ کر بھینسا گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اور چاہا کہ گھوڑے کے ایک ٹکّر مارے۔ لیکن ہر طرف سے جانوروں نے اسے روکا اور کہنا شروع کیا۔

"واہ بھئی وا! یہ خوب رہی۔ جنگل کی گھاس اگر کسی ایک کی ہوتی تو کاہے کو کوئی جیئے گا۔ اب تک تو کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جنگل کا مالک میں ہوں۔ اب یہ جھگڑا شروع ہو گیا۔"

جنگل کے زیادہ جانور یہی بات کہہ رہے تھے۔ جو گھاس کے مالک بننا چاہتے تھے۔ وہ تو بس ایک گدھا۔ دوسرا بیل۔ تیسرا بھینسا، اور ایسے ہی دو چار اور بڑے پیٹ والے جانور تھے۔ لیکن زیادہ جانوروں کے مقابلے میں چار چھ بڑے جانوروں کی بات نہ چلی۔ اور یہ سوچا جانے لگا کہ سچ مچ گھاس کا مالک کون ہے؟

بہت سوچنے پر بھی یہ فیصلہ نہ ہوسکا کہ گھاس کا مالک کون ہوسکتا ہے۔ آخر طے پایا کہ چل کر مٹھو میاں سے پوچھنا چاہئے۔

سب مٹھو میاں کے پاس گئے اور ان کے سامنے ساری بات رکھا۔

مٹھو میاں نے کچھ دیر سوچا اس کے بعد بولے:

''گھاس کا مالک تو وہ ہوسکتا ہے جو گھاس بنا لے۔''

''گھاس ہم میں سے کون بنا سکتا ہے؟'' تمام جانوروں نے مٹھو میاں سے کہا۔

''تو پھر تم گھاس کے مالک کس طرح ہو سکتے ہو۔'' مٹھو میاں نے ڈانٹا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم گھاس کے مالک نہیں تو گھاس کھا بھی نہیں سکتے؟'' سارے جانوروں نے پوچھا۔

مٹھو میاں نے ذرا کی ذرا گردن جھکائی۔ اس کے بعد بولے:

''کیا تم سب یہ جانتے ہو کہ گھاس کون پیدا کرتا ہے؟''

''گھاس تو اللہ میاں نے پیدا کی ہے۔'' تمام جانوروں نے جواب دیا۔

''تو بس!'' مٹھو میاں نے فیصلہ کیا۔ ''تو بس گھاس کا مالک اللہ ہی ہے اور گھاس ہی کیا سبھی کچھ اس نے پیدا کیا ہے۔ وہ تو سبھی کا مالک ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی چیز کو جو اپنی کہے اور مالک بن بیٹھے وہ جھوٹا اور ظالم ہے۔ اب تم سب جاؤ اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو کھاؤ پیو اور اس کا شکر ادا کرو اور اسی کو اپنا مالک سمجھو اور جو جانور اپنے کو مالک کہے تو تم سب مل کر اس سے لڑو۔ اتنا لڑو، اتنا لڑو کہ یا تو وہ توبہ کرے یا پھر جنگل ہی سے نکل جائے۔''

مٹھو میاں کی بات اور ان کے فیصلے کو سب نے پسند کیا۔ اب جو سارے جانوروں کو ایک رائے دیکھا تو گدھے کو کچھ عقل آئی۔ بیل بھی کچھ سمجھا اور بھینسا بھی کچھ نہ بول سکا۔ اور سب اِدھر اُدھر جا کر گھاس چرنے لگے۔

☆☆☆

گیارہ آنے کا ٹکٹ

ایک بار میں اپنے شہر کے ٹکٹ گھر گیا۔ وہاں ایک آدمی بابو سے گیارہ آنے کا ٹکٹ مانگ رہا تھا۔ بابو اس سے کہتا کہ بھائی یہاں اسٹیشنوں میں سے جس جگہ کا چاہو، ٹکٹ لے لو۔ گیارہ آنے بارہ آنے والا ٹکٹ نہیں ہوتا۔

میں نے یہ سنا تو مجھے بھی تعجب ہوا کہ یہ گیارہ آنے والا ٹکٹ کیسا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید اس آدمی کا دماغ خراب ہے۔ لیکن جب میں نے اس آدمی کو اچھی طرح دیکھا تو وہ مجھے بڑا اشریف اور پڑھا لکھا آدمی نظر آیا۔ وہ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ جوتا پاجامہ، شیروانی، اچھی خاصی ٹوپی پہنے تھا اور چہرے پر بڑی خوبصورت داڑھی بھی تھی۔ اس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑا مہذب آدمی ہے۔ میں نے بھی اس سے کہا۔

''بھائی! آپ کسی اسٹیشن کا ٹکٹ کیوں نہیں مانگتے۔ گیارہ آنے کا ٹکٹ کیوں مانگتے ہو؟''

اس شریف آدمی نے کہا۔ ''مجھے صرف گیارہ آنے کا ٹکٹ

چاہئے۔" یہ کہہ کر وہ آدمی پھر سے بابو سے کہنے لگا۔

"اچھا جناب! یہاں سے کوئی اسٹیشن ایسا بھی ہے جہاں کا ٹکٹ گیارہ آنے کے لگ بھگ ہو؟"

بابو نے کہا۔ "ہاں ایسا تو ہے۔" اس آدمی نے جلدی سے کہا۔ "تو پھر وہیں کا ٹکٹ دے دیجئے۔"

بابو نے ایک ٹکٹ نکالا اور گیارہ آنے پیسے لے کر ٹکٹ دے دیا۔ اس شریف آدمی نے ٹکٹ لیا اور اسی جگہ پھاڑ کر پھینک دیا اور ایک طرف چل دیا۔ اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا۔ میرے دل نے کہا۔ "یہ آدمی دیکھنے میں اچھا خاصا ہے۔ لیکن اس کے دماغ میں ضرور ضرور خرابی ہے۔" میں اسے دیکھنے لگا۔ پھر میرے دل نے کہا، اس آدمی سے مل کر اصل بات جاننا چاہئے۔ میں اس کے پیچھے چلا۔ وہ ایک گلی میں مڑ چکا تھا۔ میں گلی میں اس سے جا ملا۔ میں نے پاس پہنچتے ہی پوچھا۔ "بھائی! آپ نے ٹکٹ لے کر پھاڑ ڈالا۔ اس میں کیا بھید ہے؟"

اس نے میری طرف دیکھا۔ مسکرایا۔ مجھ سے بولا۔ "آیئے تشریف لایئے۔ میرا گھر قریب ہی ہے۔ وہاں چل کر آرام سے بیٹھئے۔

وہیں میں آپ کو یہ بھید بھی بتاؤں گا۔‘‘ میں اس کے ساتھ ہی ہولیا۔ دو منٹ میں اس کا گھر آیا۔ اس نے اندر جا کر کمرہ کھولا۔ مجھے بٹھایا۔

اس نے بتایا بھائی! بات یہ ہے کہ میرا بھتیجہ کان پور سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ کچھ اور لڑکے تھے اور لڑکوں کے ساتھ ایک بزرگ بھی۔ ٹکٹ لینے میں کچھ غلطی ہوگئی کہ وہ میرے بھتیجے کا ٹکٹ لینا بھول گئے۔ لکھنؤ میں جب سب اترے تو ان بزرگ نے گیٹ بابو کو سارے ٹکٹ دے دیئے۔ اور بچّوں کو باہر نکال دیا۔ بابو نے کچھ گنا گنایا نہیں۔ باہر آکر ان لوگوں نے لڑکوں کو گنا تو ایک کو زیادہ پایا۔ یہ ایک زیادہ میرا بھتیجہ ہی تھا۔ لکھنؤ سے انھوں نے ٹکٹ پورے لئے اور یہاں آکر سارا حال بتاتے ہوئے کان پور سے لکھنؤ تک کا کرایہ گیارہ آنے مجھے واپس کر گئے۔ تو بھائی! جب میرا بھتیجہ کان پور سے لکھنؤ تک سواری میں آیا تو مجھے سواری کا کرایہ دینا چاہئے۔ میں نے سوچا یہ گیارہ آنے ریلوے کو کس طرح بھیجوں۔ منی آرڈر کرنا اور بھیجنا بڑے جھنجھٹ کی بات ہے۔ پھر مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ اس طرح کی رقم کیسے بھیجنی چاہئے۔ اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ گیارہ آنے کا ٹکٹ لے کر پھاڑ دوں۔ اس طرح رقم ریل کے محکمے کو

پہنچ جائے گی۔ اور میرے ذمہ ریل کا کوئی پیسہ نہیں رہے گا۔"

یہ سن کر میں نے کہا۔ "اگر آج آپ یہ گیارہ آنے اس طرح ریل کو نہ دیتے تو ریل والے کیا کر سکتے تھے آپ کا۔" انھوں نے جواب دیا۔ "بھائی! کر سکنے کا کیا سوال ہے؟" "یہ تو امانت میں خیانت ہوئی اور خیانت کرنے والے سے خدا خوش نہیں ہوتا۔ اور جس سے خدا خوش نہیں ہوتا۔ آپ جانتے ہیں اس کا آخری ٹھکانہ کہاں ہوگا؟"

اس بھلے آدمی کی یہ بات سن کر میں بہت خوش ہوا۔ میرے ایمان میں مضبوطی آئی اور میں نے سوچا۔ "کیسا نیک اور ایمان دار آدمی ہے یہ۔" اس کے بعد میں اسے سلام کر کے چلا آیا۔ اس بات کو بہت دن ہو گئے۔ مگر مجھے وہ بھلا آدمی نہیں بھولا۔ میری دعا ہے کہ اگر وہ زندہ ہو تو خوش رہے اور اگر وہ مر گیا ہو تو خدا اس پر اپنا رحم کرے۔

☆☆☆

دو لڑکے

ایک بار میں کان پور سے لکھنؤ کے لئے چلا۔ اسٹیشن پر آیا تو جس پلیٹ فارم سے لکھنؤ کی گاڑی چھوٹتی تھی ۔اس پر میں نے گاڑی کھڑی دیکھی۔ گاڑی چھوٹنے کے لئے سیٹی دے رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا گیا اور جا کر اس میں بیٹھ گیا اور گاڑی چھوٹ گئی۔ گاڑی جب اُنّاؤ پہنچ کر چھوٹی تو میں نے دیکھا کہ اب گاڑی کسی دوسری لائن پر جا رہی ہے۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ میں نے دوسرے مسافروں سے پوچھا کہ ''کیا یہ گاڑی لکھنؤ نہیں جا رہی ہے؟'' لوگوں نے بتایا کہ نہیں۔ لکھنؤ والی گاڑی تو کان پور میں اس سے پانچ منٹ پہلے ہی چھوٹ چکی تھی۔ اور اسی پلیٹ فارم سے چھوٹی تھی جس سے یہ گاڑی چھوٹی۔''

اب میں بہت پریشان ہوا۔ اُنّاؤ کے بعد دوسری لائن پر جو اسٹیشن پڑا۔ وہاں اُتر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ میرے پاس سامان بھی تھا۔ ایک بکس ایک بستر اور ایک بڑا تھیلا۔ میں نے ایک تالاب پہ جا کر وضو کیا، نماز پڑھی اور سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہئے۔ اسٹیشن پر کچھ

لوگ تھے، ان سے پوچھا۔ ''کان پور سے لکھنؤ جانے والی پختہ سڑک کتنی دور ہے؟'' معلوم ہوا کہ وہ ایک میل ہے۔'' اور راستہ بڑا ہی پیچ دار ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر قلی بھی نہیں مل سکتے اور اسٹیشن سے گاؤں بھی آدھ میل ہے۔

اب میں بہت پریشان ہوا۔ اسٹیشن پر ایک لڑکا ٹہل رہا تھا۔ اس کی عمر ۱۸ یا ۱۹ برس کی ہوگی۔ وہ ٹہل ٹہل کر مجھے دیکھ بھی رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آیا اور بولا۔ ''چلیئے میں آپ کو سڑک تک پہنچادوں وہاں سے آپ بس پر لکھنؤ چلے جایئے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے بکس اٹھایا اور کندھے پر رکھ لیا۔ میں نے بہت نہیں نہیں کی، مگر وہ نہ مانا۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ انجان جگہ، انجان لوگ۔ یہ لڑکا بھی انجان، کہیں دھوکا نہ دے۔ لیکن اس لڑکے نے اس نرمی سے بات کی کہ میں اللہ کا نام لے کر اس کے ساتھ ہو لیا۔ بستر اور تھیلا میں نے لادا۔

سچ مچ راستہ بڑا پیچ دار تھا۔ میرا بکس بڑا وزنی تھا۔ لڑکا کڑیل جوان۔ اس کے بوجھ سے پسینے پسینے ہوگیا۔ راستے میں کئی جگہ ٹھہر ٹھہر کر اس نے کندھا بدلا۔ بکس اس کندھے سے اس کندھے پر رکھا۔

لیکن شاباشی ہے اس لڑکے کو۔ اس نے سڑک پر جا کر ہی دم لیا۔ بکس اتار کر سڑک پر رکھا اور چلا گیا۔ جب وہ چلا تو میں اس وقت تک اُسے دیکھتا رہا جب تک وہ دوسرے موڑ پر جا کر نہ چھپ گیا۔

اب میں بس کے لئے بیٹھا۔ اس وقت مجھے شہر لکھنؤ کا ایک لڑکا یاد آرہا تھا۔ جس نے مجھے بارودخانہ کا غلط پتہ بتا دیا تھا اور میں دو گھنٹے پریشان رہا تھا۔

☆☆☆

منکر نکیر

''اخاہ، نور میاں!.........السلام علیکم''

''وعلیکم السلام۔ ایں آپ! ارے بھائی فردوسی آپ! یہاں کہاں؟''

''کیوں، کیا بات ہے؟''

''تم تو مر گئے تھے۔''

''تو پھر؟''

''پھر یہ کہ تم پھر یہاں کیسے موجود ہو؟''

''موجود، واہ موجود ہونے کی ایک ہی کہی، مرنے سے کوئی مٹ تو جاتا نہیں۔''

''یہ تم نے نئی بات کہی۔ ارے بھائی! مرنا اور مٹ جانا ایک ہی بات ہے۔''

''نہیں، موت کے معنیٰ مٹ جانا نہیں ہیں۔''

''پھر کیا ہیں؟''

''موت کے یہ معنیٰ ہیں کہ دنیا کی زندگی ختم ہوگئی اور آخرت کی زندگی شروع ہونے کو ہے۔''

''ارے ہاں، ٹھیک کہا تم نے فردوسی! مجھے یاد آیا۔ مرکر انسان مٹ نہیں جاتا بلکہ اس دنیا سے اس دنیا کی طرف جاتا ہے، جہاں ہر ایک کو اس کے کئے ہوئے کاموں کا پھل ملے گا۔ ہے نا یہ بات؟''

''بالکل ٹھیک۔ رسالہ دینیات میں یہی تو پڑھا ہوگا تم نے۔''

''ہاں یہی پڑھا ہے۔''

''تو پھر اب میں جو تمہارے سامنے ہوں تو تمہیں اچنبھا کاہے کا۔''

''نہیں۔ اب مجھے اچنبھا نہیں مگر یار فردوسی! ذرا یہ تو بتاؤ کہ

مرنے کے بعد تم پر کیا بیتی ؟''

''اللہ کا شکر ہے کہ بڑے سکھ سے ہوں۔'' یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ایک رات میرے گھر ڈاکہ پڑا تھا اور ایک ڈاکو نے میرے ابّا جان پر گولی چلا دی تھی۔ لیکن اسے گولی چلاتے میں نے دیکھ لیا تھا۔ تو جھٹ میں ابّا جان کے آگے آ گیا۔ گولی میرے سینے میں لگی۔ ''اُف اللہ'' کے ساتھ ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه'' میری زبان سے نکلا اور تھوڑی ہی دیر میں میری سانس اکھڑ گئی۔ اس کے بعد صبح دفن کر دیا گیا۔ یہاں تک تو تم کو سارا حال معلوم ہے، معلوم ہے نا!''

''ہاں بھائی! یہ تو سب میں جانتا ہوں۔ شاید تم کو یہ نہ معلوم ہو کہ تمہارے مرنے کے بعد میں بہت رویا تھا۔ تم ہی میرے وہ ساتھی تھے کہ میرے ساتھ مل کر پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ اجتماع کرتے تھے۔ بچوں کو قرآن کا ترجمہ پڑھ کر سناتے تھے۔ اللہ کے حکم سمجھاتے تھے۔ نبیوں کے حالات سناتے تھے۔ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری باتیں بتاتے تھے۔ صحابہؓ کے قصے کہا کرتے تھے۔

''کہو اب کیا حال ہے۔''

’’بھائی جو کچھ ہوسکتا ہے، کررہا ہوں۔ لیکن اس وقت تو تم اپنی ہی کہو۔‘‘

’’اچھی بات ہے۔ اچھا تو جب مجھے دفن کر دیا گیا تو تھوڑی ہی دیر بعد مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے سوتے سے جگا دیا ہو۔ مجھے اپنے آس پاس اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔

نور میاں! تم میری عادت جانتے ہو کہ جب میں سو کر اٹھتا تھا تو یہ دعا ضرور پڑھتا تھا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَ اِلَیْہِ النُّشُوْرُ

’’بے شک فردوسی بھائی! تم یہ دعا تو پڑھا ہی کرتے تھے۔ تم نے مجھے بھی یہ دعا سکھائی تھی اور اس کا مطلب بھی بتایا تھا۔‘‘

’’یاد ہے اس کا مطلب؟‘‘

’’ہاں، ہاں۔ بالکل یاد ہے! سناؤں۔‘‘

’’سناؤ تو ذرا۔‘‘

اس دعا کا مطلب یہ ہے کہ ’’شکر اور احسان ہے اللہ کا جس نے ہمیں زندہ کیا موت کے بعد اور دوبارہ زندہ ہو کر اسی کے پاس

جانا ہے۔''

''شاباش میاں نور! تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی باتوں کو خوب یاد رکھتے ہو۔''

اچھا تو قبر کے اندھیرے میں میں نے یہ دعا پڑھی تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ ایک دم پیارا پیارا اجالا قبر میں پھیل گیا۔ میں اس کی اچھائی تم کو سمجھا ہی نہیں سکتا۔

''نور میاں! اس اجالے میں چمک نہیں تھی۔ اس سے میری آنکھیں جھپکتی نہ تھیں۔ اس اجالے سے میری آنکھوں میں ٹھنڈک پہنچتی تھی اور پھر ایسا لگا کہ میرے جسم میں تراوٹ بھری جارہی ہے۔

اور تو سنو، قبر تو ایک چوکور گڈھا سا بنائی جاتی ہے۔ مگر میں نے اس روشنی میں دیکھا تو اس جگہ کا تو پتہ نہیں جہاں مجھے دفن کیا گیا تھا۔ بھائی! میں تو کھلی اور بڑی جگہ میں تھا۔ دور تک ہرا بھرا میدان ہی میدان ہو۔ میں حیران تھا کہ میری قبر میں اتنا پھیلاؤ کہاں سے آ گیا؟ اچانک ایک طرف سے دو فرشتے آ گئے، سمجھے تم کون؟''

''ہاں ہاں سمجھا کیوں نہیں۔ منکر نکیر ہی تو۔ انھیں دیکھ کر تو تم بہت ہی ڈرے ہو گے۔''

''نا! ان کو دیکھ کر میں ڈرا نہیں۔ مجھے تو انھیں دیکھ کر ذرا بھی ڈر نہ لگا۔''

''تو کیا ان کی صورت ڈراؤنی نہ تھی۔ تو کیا ان کے ہاتھوں میں آگ کے گرز نہ تھے، تو کیا وہ زمین پھاڑتے ہوئے نہیں آئے تھے؟ رسالہ دینیات میں تو یہی لکھا ہے۔''

''رسالہ دینیات میں ٹھیک لکھا ہے۔ دونوں فرشتے تھے۔ تو بڑے ہی لمبے قد کے ان کے پاس گرز بھی تھے۔ مگر وہ ان کی پیٹھوں پر لٹک رہے تھے اور میں یہ بھی نہ جان سکا کہ وہ کس طرف سے آ گئے۔ وہ اچانک سامنے آ کھڑے ہوئے اور میں ڈرا اس لئے نہیں کہ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔''

''اچھا میں سمجھا فردوسی بھائی! تم نے دنیا میں اچھے کام کئے تھے تو تمہارے پاس منکر نکیر اس شکل سے نہ آئے تھے۔ یاد آیا بھیانک اور ڈراؤنی شکل سے تو وہ برے لوگوں کے پاس آئیں گے، بھلا تمہارے پاس اس طرح کیوں آتے۔

پھر تم قبر میں جو زندہ ہوئے تو تمہاری زبان سے اللہ کا نام نکلا۔ اس وقت اگر وہ قریب ہوں گے تو انھوں نے ضرور سن لیا ہوگا اور سمجھ

گئے ہوں گے کہ یہ کوئی نیک بندہ ہے۔ مؤمن بندہ۔''

''لیکن سنو تو نور بھائی! اس پر بھی منکر نکیر نے مجھ سے پوچھا۔

''مَنْ رَبُّكَ'' میں جھٹ جواب دیا۔

''میرا رب اللہ ہے۔''

سنا تم نے کتنا آسان سوال کیا مجھ سے۔ اس سوال کا جواب تو میری زبان پر تھا۔ درس گاہ میں تو اسے ایسا رٹ لیا تھا کہ بھولا ہی نہیں۔''

''لیکن سنو تو فردوسی بھائی! جو لوگ بُری باتیں کہا سنا کرتے ہیں، ان کی زبان سے تو یہ جواب وہاں نکل ہی نہ سکے گا۔''

''ہے نا یہ بات!''

''بے شک، اور سنو، اس کے بعد فرشتوں نے جو سوال کیا۔ وہ چاہے دوسروں کے لئے مشکل ہو تو ہو۔ میرے لئے ویسا ہی آسان نکلا۔ دونوں فرشتوں نے مسکرا کر پوچھا۔ ''مَا دِيْنُكَ'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا دین اسلام ہے۔''

''ہاں بھائی! درس گاہ کی پڑھائی بڑے کام آئی۔ اچھا سنو، اس کے بعد منکر نکیر نے مجھ سے ایسی بات پوچھی کہ اسے سن کر مارے خوشی کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''

''آنسو؟''

''ہاں کبھی کبھی بہت زیادہ خوشی میں بھی تو آنسو آ جاتے ہیں۔ تمھیں یاد نہیں بڑی چھٹی میں ایک بار جب میں اپنے ننھیال چلا گیا۔ تو تم اکیلے کیسے پریشان ہو رہے تھے۔ پھر جب میں واپس آیا تو تم کیسا لپٹ کر رو رہے تھے۔ بتاؤ وہ رونا خوشی کا تھا کہ رنج کا تھا۔''

''وہ رونا تو خوشی کا تھا۔''

''تو بس میرے آنسو بھی ایسے ہی تھے۔''

''تو منکر نکیر نے کس کا نام لیا تھا؟''

''اونھ، تم بھول گئے نور میاں! رسالہ دینیات میں تو یہ بھی لکھا ہے۔ یاد کرو، میرے سامنے فرشتوں نے پیارے رسولؐ کا نام لیا تھا۔ میں نے سنتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہا اور تم جانتے ہو کہ ایک مسلمان کو پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت ہوتی ہے وہ اپنی جان، مال اولاد سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ تو نور بھائی! پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سنا تو محبت کے مارے میرے آنسو آ گئے۔ فرشتوں نے میرے آنسو دیکھ لئے۔ شاید وہ سمجھ گئے۔ یہ میں نے ایسے جانا کہ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''فردوسی! ان

سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ میں نے جواب دیا۔

''یہ ہمارے پیارے رسولؐ ہیں۔ درود اور سلام ہو ان پر۔ یہ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ پیارے رسولؐ نے ہمیں اللہ کی پہچان بتائی۔ اس کی بندگی سکھائی۔ پیارے رسولؐ نے ہم کو اللہ کے حکم سنائے۔ ان پر چلنا سکھایا اور اللہ چاہے گا تو آخرت میں اللہ کے سامنے پیارے رسولؐ ہمیں بھولیں گے نہیں اور ہماری بخشش کی سفارش اللہ سے ضرور کریں گے۔''

''پھر تو منکر نکیر بہت خوش ہوئے ہوں گے۔ جنت کی کھڑکی کھول دی ہوگی۔''

''اور کیا، خوشی تو ہوئی ہی، اور بھائی جنت کی کھڑکی کو نہ پوچھو۔ اس وقت میرے آس پاس ایسا نور پھیلا تھا۔''

''نور پھیلا تھا، تم نے مجھے بھی یاد کیا اس وقت؟''

''اس لئے کہ تمہارا نام بھی نور ہے۔''

''اس لئے کہ میں تمہارا دوست ہوں۔''

''سچ پوچھو تو میں نے اس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ اپنے ہر بندے پر ایسا ہی فضل کرے۔ منکر نکیر کے سوالوں کا جواب دینا

آسان فرمادے۔ پھر تو مزے ہی مزے ہیں یار!''

''یار فردوسی! ذرا ان مزوں کا حال تو سناؤ۔''

''حال؟''

منکر نکیر مجھ سے بہت خوش ہوئے۔ بولے۔ ''فردوسی! لو مزہ کرو۔ ادھر دیکھو تو۔'' میں نے ادھر دیکھا۔ تو بس پھر میں بیان نہیں کرسکتا۔ سچ مچ انھوں نے جنت کی کھڑکی کھول دی تھی۔ میں نے وہ سب دیکھا جو پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی اور جو ہماری کتاب حصّہ چہارم کے معراج والے سبق میں ہے۔ سونے کے محل، چاندی کے محل، موتیوں کے بنگلے، زمرد کے بالا خانے، نیلم کے جھروکے، ہیروں کی حویلیاں، پکھراج کی کوٹھیاں اور انہی کے پلنگ، انہی کی چوکیاں، حوریں اور غلمان بادشاہوں سے بھی لاکھ درجہ بہتر لباس پہنے۔ اِدھر اُدھر اس طرح گھوم رہے تھے جیسے موتی پھر رہے ہوں۔''

''اہاہاہا۔''

''اہاہاہا۔ تم سن کر کہہ رہے ہو۔ دیکھو تو رال ٹپک پڑے اور ایسے ایسے پھل کہ دیکھنے ہی سے مزا آجائے۔ اسی لئے تو تم کو پڑھایا

جاتا ہے کہ اللہ کے حکموں پر چلو۔ اللہ میاں جنت دیں گے۔ میں نے اسی کھڑکی سے دیکھا۔ قرآن میں پڑھا تھا۔ اب دیکھ لیا کہ جنت کے نیچے تو سدا سے پانی کی نہریں جاری ہیں۔ پت جھڑ کا موسم تو جنت میں ہوتا ہی نہیں۔ ہر وقت ایسا رہتا ہے جیسے فجر کے وقت پیاری پیاری بہت پیاری روشنی۔ پھر ہر طرف طرح طرح کے پھلوں اور پھولوں کے چمن۔ طرح طرح کی روشیں۔ ایک طرف انگور کی بیلیں اور ان میں بڑے بڑے انگوروں کے گچھے، ایک طرف آم، ایک طرف امرود، سیب، انار، لیچی، ارے بھائی! گناؤں کہاں تک۔ بس تم نے کتابوں میں جو کچھ پڑھا ہے۔ وہ حرف حرف ٹھیک ہے۔ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ہر بات صحیح پائی۔"

"تو یار! تم تو خوب مزے سے کھاتے ہو گے۔"

"نہیں۔ ابھی جنت میں جانے کا موقع نہیں ملا۔ منکر نکیر نے بتایا کہ کھڑکی سے یہ جو جنت کی بہار دکھائی دے رہی ہے۔ یہ سب تمہارے ہی لئے ہے۔ لیکن ابھی تم اس میں نہیں جا سکتے۔ اس میں داخل اس وقت ہو گے جب قیامت میں ذرہ ذرہ قطرہ قطرہ حساب کتاب ہو گا۔

اچھا فردوسی! اب قیامت تک چین سے سوؤ۔ تمہارے لئے نہ یہاں کوئی غم ہے اور نہ کھٹکا اور نہ آخرت میں کوئی پریشانی ہوگی۔''

نور میاں! یہ خوش خبری سنی تو میں خوشی سے جھومنے لگا۔ ایسا مست ہوا کہ یہ خیال بھی نہ رہا کہ فرشتے میرے پاس کھڑے ہیں۔ میں سجدے میں گر گیا اور اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔ سجدے سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ فرشتے ندارد۔

''پھر کیا ہوا فردوسی بھائی۔''

''پھر کیا۔ پھر رات دن چین کی بنسی بجتی ہے۔ جنت کی کھڑکی سے جنت کی ہوا آتی رہتی ہے۔ یہ ہوا ایسی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری نعمتیں اسی وقت دے دیں۔''

''یار ایک بات بتاؤ۔ تم اللہ کے پیارے بندے ہوگئے۔ ذرا میرے لئے اللہ میاں سے دعا کرنا کہ اللہ مجھ پر بھی یہی فضل فرمائے۔''

''نور میاں! دیکھو، صاف بات یہ ہے کہ اللہ کا فضل اسی کو ملتا ہے جو اللہ کے حکموں پر اس طرح چلتا ہے جس طرح پیارے رسول

صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔ تو بس میری نصیحت یہ ہے کہ تم پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی باتوں پر ٹھیک چلو اور اللہ سے امید رکھو وہ رحمت کی جگہ عطا فرمائے گا۔"

"اچھا بھائی فردوسی! ایک بات اور بتا دو۔"

"بس نور میاں! بہت کچھ بتا دیا۔ اب چلے۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔"

فردوسی کے سلام کا جواب میں دے بھی نہ پایا تھا کہ ایک چمک سی ہوئی۔ میری آنکھ ذرا کی ذرا جھپکی اور پھر کھلی تو دیکھا کہ فردوسی غائب ہے اور میں اپنی چارپائی پر لیٹا ہوا ہوں۔

مجھے یاد آیا کہ ماسٹر صاحب نے منکر نکیر کے سوال اور ان کے جواب یاد کرنے کو کہا تھا۔ وہی یاد کرتے کرتے میں سو گیا تھا اور فردوسی سے خواب ہی میں ملاقات ہوئی۔

☆☆☆

ہاتھیوں کا بٹوارہ

بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک آدمی تھا۔ وہ ہاتھیوں کی تجارت کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ جس وقت وہ مرا تو اس کے گھر ۱۷ ہاتھ تھے۔ مرنے سے پہلے اُس نے ہاتھیوں کے بٹوارے کے لئے اس طرح کا پرچہ لکھ کر بیٹوں کو دے دیا۔

بڑے بیٹے کو کُل ہاتھیوں میں سے .... $\frac{1}{2}$

منجھلے بیٹے کو کُل ہاتھیوں میں سے .... $\frac{1}{3}$

چھوٹے بیٹے کو کُل ہاتھیوں میں سے .... $\frac{1}{9}$

اور جب تک یہ بٹوارہ نہ ہو جائے بڑا بیٹا ان کی دیکھ بھال کرے۔

جب یہ بٹوارہ ہونے لگا تو ایک مشکل یہ سامنے آئی کہ ۱۷ ہاتھیوں کا $\frac{1}{2}$ یعنی آدھا کیسے کیا جائے؟ ۱۷ ہاتھیوں کا $\frac{1}{2}$ یعنی آدھا کرنے میں ایک ہاتھی کاٹ کر کیسے بانٹا جائے؟ اسی طرح ۱۷ کا $\frac{1}{3}$ یعنی ایک تہائی کرنے میں بھی پریشانی تھی۔ اور ۱۷ کا $\frac{1}{9}$ یعنی نواں حصہ بھی پورا پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ہر طرح ہاتھیوں کو کاٹنا پڑتا تھا اور اس طرح ظاہر ہے کہ ہاتھی بانٹے نہیں جا سکتے۔

بہت سوچا گیا، آخر تینوں بیٹے قاضی کے پاس پہنچے۔ لوگوں کو معلوم ہوا تو وہ بھی یہ بٹوارہ دیکھنے کے لئے قاضی کی عدالت میں پہنچے کہ دیکھیں قاضی صاحب کس طرح ہاتھیوں کو بانٹتے ہیں۔

قاضی صاحب نے لڑکوں کے باپ کا پرچہ پڑھا۔ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر ایک ہاتھی اور منگایا۔ اب ہو گئے ۱۸ ہاتھی۔ قاضی صاحب نے ۱۸ کا $\frac{۱}{۲}$ یعنی آدھا حصہ بڑے لڑکے کو دے دیا۔ بڑے لڑکے کو ۹ ہاتھی مل گئے۔ ۱۷ کا آدھا ساڑھے آٹھ ہوتے تھے۔ اس طرح اُسے ۹ ملے۔ پھر قاضی صاحب نے ۱۸ کا $\frac{۱}{۳}$ حصہ نکالا تو اس طرح منجھلے بیٹے کو ۶ ہاتھی مل گئے۔ اور ۱۸ کا $\frac{۱}{۹}$ حصہ کرنے پر چھوٹے بیٹے کو ۲ ہاتھی ملے۔ اب حساب کیجئے۔ دیکھئے:

بڑے بیٹے کو.................. ۹ ہاتھی

منجھلے بیٹے کو.................. ۶ ہاتھی

چھوٹے بیٹے کو.................. ۲ ہاتھی

کل ۱۷ ہاتھی

۱۸ میں سے ایک ہاتھی بچ گیا۔ تو قاضی صاحب نے جہاں سے ہاتھی منگایا تھا، وہیں بھیج دیا۔ جو لوگ یہ بٹوارہ دیکھنے آئے تھے،

وہ قاضی صاحب کی سمجھ داری دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور انھوں نے قاضی صاحب کی سمجھ داری کی تعریف بھی بہت کی۔

لیکن اب بڑے بیٹے کا لالچ دیکھئے۔ اس نے سوچا کہ اگر ہاتھی بانٹے نہ جاتے تو یہ سارے ہاتھی اپنے پاس رہتے۔ اس نے قاضی صاحب کے بٹوارے کو منظور نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ ۱۷ ہاتھیوں میں سے پورے پورے ہاتھی بانٹئے۔ یہ ان میں ایک ہاتھی ملایا کیوں گیا؟

بڑے بیٹے کا یہ لالچ قاضی صاحب سمجھ گئے کہ وہ دوسرے بھائیوں کا حق مارنا چاہتا ہے۔ اب قاضی صاحب نے پھر لڑکوں کے باپ کا پرچہ دیکھا۔ پرچے میں صاف صاف $\frac{1}{2}$ ، $\frac{1}{3}$ ، $\frac{1}{9}$ لکھا تھا۔ قاضی صاحب کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ''اچھا کل بٹوارہ کروں گا۔''

دوسرے دن بٹوارہ دیکھنے والے بہت زیادہ آدمی اکٹھا ہو گئے۔ سب یہ سوچ رہے تھے کہ دیکھیں قاضی صاحب اب کس طرح ہاتھی باٹیں گے۔ دوسرے دن قاضی صاحب نے ایک پُل کے پاس جا کر حکم دیا کہ سارے ہاتھی یہاں لائے جائیں۔ ہاتھی پُل کے پاس لائے گئے۔ تو قاضی صاحب نے لڑکوں سے وعدہ لے لیا کہ آج جو بٹوارہ ہوگا۔ وہ ہر طرح منظور کرنا ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ہاتھی پُل کے اوپر کھڑا

کیا اور دو ہاتھی پُل کے نیچے کھڑے کئے۔ پھر کہنے لگے کہ دیکھو تمہارے باپ نے بڑے بیٹے کو ½ ہاتھی دیئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہاتھی اوپر اور دو ہاتھی نیچے۔ یہ دیکھو ایک اوپر اور دو نیچے ہاتھی ہیں۔ بڑا بیٹا یہ ہاتھی لے جائے اس طرح بڑے بیٹے کو ۳ ہاتھی ملے۔

اس کے بعد قاضی صاحب نے ایک ہاتھی پُل کے اوپر اور تین نیچے کھڑے کئے اور کہا کہ دیکھو ⅓ ہو گئے۔ یہ چار منجھلا بیٹا لے جائے۔ آخر میں قاضی صاحب نے ایک ہاتھی پُل کے اوپر ۹ نیچے کھڑے کئے اور کہا کہ یہ دیکھو ⅑ ہو گئے۔ یہ دس ہاتھی چھوٹا بیٹا لے جائے۔ اب سب کو اس طرح ملے:

بڑے بیٹے کو	۳ ہاتھی
منجھلے بیٹے کو	۴ ہاتھی
چھوٹے بیٹے کو	۱۰ ہاتھی
	کل ۱۷ ہاتھی

یہ انوکھا نرالا بٹوارہ دیکھ کر سب لوگ دنگ رہ گئے اور بڑا بیٹا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ یہ آخری فیصلہ تھا۔

☆☆☆